ڈاکٹر وزیر آغا اور خالص ادب کی روایت

ڈاکٹر محمد خاں اشرف ☆
ڈاکٹر عظمت رباب ☆☆

Dr. Wazeer Agha and tradition of pure literature

Dr. Muhammad Khan Ashraf
Dr. Azmat Rubab

Abstract:

Dr. Wazir Agha is one of those rare persons who spent his entire life in the pursuit of his literary ideas. Literature for him was not a profession to earn livelihood but a way of life. He had his admirers as well as detractors and his life and works were mired in controversies with progressive writers particularly Ahmad Nadeem Qasmi. He had his differences with Dr. Saleem Akhtar as well. But now after his death it is important that we try to assess his work, particularly his critical ideas dispassionately. This research paper is an effort in this direction and evaluates his literary theory in the context of his times and Urdu Literary History.

Key words:

Wazeer Agha, Clanical literature, Poet, Tradition, Criticism

کلیدی الفاظ:

وزیر آغا، کلاسیکل ادب، شعر، اوراقِ، ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی

ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اردو ادب میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے تمام عمر ادب کی تخلیق، تفہیم، تنقید اور تعبیر میں بسر کر دی۔ بہت کم لوگ ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انھیں یہ فراغت، فرصت، آسودگی، سہولت اور مالی وسائل میسر ہوں اور وہ عمرِ

☆ لاہور گیریژن یونیورسٹی
☆☆ لاہور کالج برائے خواتین یونیوسٹی

عزیز کے تمام برس اپنے جمالیاتی مشغلے اور فنی و ادبی مقصود و مدعا کی جستجو اور تلاش میں اس طرح بسر کر دیں کہ ان کو بڑی حد تک اپنی زندگی ہی میں اپنے مقام و مرتبے کا اعتراف حاصل ہو جائے۔ وسائل تو اور لوگوں کو بھی میسر ہوتے ہیں لیکن وہ انھیں دنیوی، مادی یا سیاسی مقاصد کے حصول میں صرف کر دیتے ہیں۔

وزیر آغا کلاسیکل ادب کے ساتھ ساتھ ہم عصر ادب سے بھی کماحقہ ' آگاہی رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ خود ایک منفرد شاعر اور نظم نگار تھے اور اس لیے اپنے عہد (بیسویں صدی کا نصف آخر) سے ہم آہنگ تھے۔ دوسرے انھوں نے اپنے عہد سے آگاہ رہنے اور اس میں ایک حرکیاتی کردار ادا کرنے کے لیے ادبی جریدہ "اوراق" نکالا جو ان کے نصب العین اور ادبی مسلک کا علمبردار رہا۔ تیسرے وہ ادب و فن کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ وہ فنی اور ذہنی طور پر اس دبستان سے متعلق رہے جو ادب کی تخلیق و تفہیم میں ادبی، فنی اور جمالیاتی معیاروں ہی کو اپنا نصب العین سمجھتا تھا اور اس میں کسی بھی قسم کے ایسے نظریے کی آمیزش کے حق میں نہیں تھا جو ادب کے ان معیاروں سے باہر ہو یعنی وہ ادب میں کسی ایسی سیاسی، معاشیا خارجی نظریاتی ملاوٹ کے حق میں نہیں تھا جو وقتی اور ہنگامی ہو[۱] دراصل یہ مکتبہ فکر اردو ادب کی ایسی شکل اور پائیدار روایت ہے جو کلاسیکل عہد سے شروع ہوئی اور آج تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی۔ اردو ادب ابتدا سے اسی روش کا حامل اور اسی روایت پر کاربند رہا۔ سارا کلاسیکل ادب اسی بنیاد پر استوار ہے کہ ادب کو پرکھنے اور جانچنے کے معیار جمالیاتی، فنی اور ادبی قدروں کے حامل ہوں۔ سرسیّد کے عہد اور پھر ترقی پسند تحریک نے ان بنیادوں پر پُرزور یلغار کی اور ادب کے لیے ایسے خارجی اور عارضی معیاروں کی ترویج کی جو سیاسی اور معاشی حوالے رکھتے تھے۔ اردو ادب کا ایک بڑا طبقہ اس سے متاثر بھی ہوا۔ بہت سا ایسا ادب پیدا ہوا جو سیاسی، مذہبی، فرقہ وارانہ، معاشی اور طبقاتی حوالے رکھتا تھا لیکن جس کا بڑا حصہ ہنگامی اور وقتی تھا۔ قت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے ادب کا ایک بڑا حصہ اپنا حوالہ اور تعلق کھو چکا ہے اور آج کے قاری کے لیے زیادہ دلکشی کا باعث نہیں رہا۔[۲]

لیکن ان ادوار میں بھی اردو ادب کے میدان میں ایک گروہ ہمیشہ ایسا موجود رہا جس نے ادب میں کسی بھی خارجی نصب العین کی ملاوٹ کو قبول نہیں کیا اور رد کر دیا۔ ترقی پسندوں نے اپنی پارٹی مینیفسٹو کے پیش نظر ایسے ادب کو "ادب برائے ادب" کا نام دیا اور اپنی روش کو "ادب برائے

زندگی" کہا۔[۳] لیکن یہ تقسیم محض ان کے پروپیگنڈا کا ایک حصہ تھی۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ادب کو معاشرے میں سیاسی اور وقتی مقاصد کا ساتھ دینا چاہیے۔[۴] زندگی کا اصل معنی زندہ ہونا ہے نہ کہ کسی خاص سیاسی یا معاشی نظریہ کا پابند ہونا۔ تمام تر ادب زندگی کا حصہ ہے۔[۵] ادب ایک ایسا معاشرتی مظہر ہے جو انسان کی انسانیت، اس کی انفرادیت، اس کی وہبی آزادی اور اس کی بہ حیثیت انسان بقا کی بنیاد ہے۔[۶] یہ انسان کے وجود کا اظہار ہے۔ ادب ایسا معاشرتی مظہر ہے جو زبان کے ذریعے اور تخیل کے راستے سے انسانی تخلیقی تجربے کا اظہار و ابلاغ کرتا ہے[۷] اور یہ تخلیقی اظہار ہی ہے جو دیگر فنونِ لطیفہ کے ہمراہ انسان اور دیگر حیاتیاتی وجودوں کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ تخلیقی اظہار انسان اور حیوان کے درمیان اصل امتیاز ہے۔[۸] ادب کی اس روایت کو اہم "خالص ادب" کی روایت قرار دے سکتے ہیں۔

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث کا آغاز کر کے ترقی پسندوں نے اس کو ایسے رنگ و آہنگ سے ہم کنار کر دیا ہے کہ اردو ادب کی اپنی پوری کلاسیکل روایت اس میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ بحث اس بنیاد پر قائم ہے کہ ادب کی تخلیق ادیب کی مرضی و منشا کی مرہونِ منت ہے جبکہ ادبی تاریخ و تنقید نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ ادبی و فنی اظہار خود ادیب کا فنکار کی مرضی و منشا کا تابع نہیں ہوتا بلکہ یہ خود اپنا راستہ بناتا ہے۔ ترقی پسندوں کی بلند آہنگی سے متاثر ہو کر اکثر قارئین، نقادوں اور ادب کے طالب علموں نے بھی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی تقسیم کو ایک طرح سے مطلق خیال کرنا شروع کر دیا جبکہ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے مروج لفظوں اور تراکیب کے معنی کو بھی بری طرح متغیر کر دیا۔ "ترقی پسندی" کی اصطلاح خود اس کا ثبوت ہے۔ ترقی پسندی جو ان کے نزدیک مارکسی سیاسی نقطۂ نظر کی ترویج ہے اپنی لفظی اور ترکیبی معنوں میں ہر گز یہ مفہوم نہیں رکھتی بلکہ اس سے مراد انسان کا بہتر مستقبل کی امید و افزائش ہے لیکن ترقی پسندوں نے اس کو اپنے مارکسی مسلک کے پرچار کے مترادف بنا دیا ورنہ مولانا صلاح الدین کے الفاظ میں "کون نہیں جو ترقی پسند نہیں بننا چاہتا۔"[۹] ان ادبی نعروں کی گونج اور الجھن سے بچنے کے لیے ہم اردو ادب کی کلاسیکی روایت کو "خالص ادب کی روایت" سے معنون کرتے ہیں۔ یہ ایسی روایت ہے جس میں ادبی تخلیق کی جانچ پرکھ کے تمام معیار ادبی، فنی اور جمالیاتی ہیں اور ادب ایسے انسانی تخلیقی تجربے کا فنکارانہ اظہار ہے جو تخیل کے راستے اور زبان کے ذریعے سے ابلاغ پاتا ہے۔

کلاسیکی عہد کا ادب تو تمام تر اسی روایت کے زیر اثر وجود میں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید عہد میں محمد حسین آزاد کا نام اس لحاظ سے اہم ہے کہ انھوں نے اس روایت کو زندہ رکھا اور آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی میں رومانوی تحریک انھی معیاروں کی حامل تھی جو ادیب کی آزادی اور ادب کے اظہار کی علمبر دار تھی۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کی یلغار اور سیلاب سب رکاوٹوں کو بہالے گئی۔ ادب کے مادی نظریے نے اردو ادیبوں اور اردو قاری کے قلب و نظر پر ایسا قبضہ کیا کہ دوسرے نقطۂ نظر کی عرصے تک کوئی گنجائش ہی پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن اس دوران میں بھی ادیبوں کے ایک گروہ نے ادب اور ادیب کی آزادی کا پرچم بلند رکھا۔ ان میں مولانا صلاح الدین احمد اور ''ادبی دنیا'' کے دیگر لکھنے والے، مرزا ادیب، میر اجی، عصمت چغتائی، منٹو اور حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ ادیب و شاعر شمار کیے جاسکتے ہیں۔ حسن عسکری، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر وغیرہ اس گروہ کے اہم اور سر کردہ نمائندے ہیں۔ ن۔م۔ راشد، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور مجید امجد، یہ سب اسی نقطۂ نظر کے حامل ادیب و شاعر تھے اور وزیر آغا بھی اسی قبیلے کے ایک فرد تھے بلکہ وہ ان کی آواز اور علمبر دار بھی تھے۔ انھوں نے اپنا یہ سفر مولانا صلاح الدین احمد کے ''ادبی دنیا'' سے میر اجی کی ہمراہی میں شروع کیا اور پھر اپنے ادبی مجلہ ''اوراق'' کا آغاز کیا جس کے ذریعے انھوں نے اپنے نصب العین اور معیار کو فروغ دیا اور نئے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی۔ وزیر آغا کے پیروکاروں میں دو گروہ نمایاں ہیں۔ ایک تو وہ جو خالص ادبی تخلیق و ترویج میں مصروف رہے اور دوسرے وہ جنھوں نے ان سے ذاتی وابستگی ہی کو اپنا معیار بنالیا ۔ اردو ادب کی یہ شاید بد قسمتی ہے کہ ایسا شخص جو ایک وسیع تر نقطۂ نظر کا حامل ہو سکتا تھا، تنگ نظری اور عصبیت کی حامل اقدار کا شکار ہو گیا۔ وزیر آغا کے پیروکاروں کی ''طرف داری'' اصل میں وزیر آغا کی شخصیت اور فن کے وسیع تر اعتراف اور پہچان میں آڑے آئی۔ وزیر آغا کا کام اور ان کا نقطۂ نظر ان کے ''طرف داروں'' کی حدود سے بہت زیادہ تھا اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ خالص ادب کے نظریے اور روایت کو قائم رکھنے میں ان کی تحریریں، مساعی اور کاوشیں یقیناً اہم ہیں اور اس کو گروہی عصبیت اور پسند و ناپسند سے بلند ہو کر دیکھنا چاہیے۔ وہ گروہ جو ان سے اختلاف رکھتا تھا اس کے بھی دو حصے کیے جاسکتے ہیں، ایک ترقی پسند جن کا اختلاف اصولی اور نظریاتی تھا اور وہ اپنے نصب العین کے لحاظ سے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ ان میں جناب احمد ندیم قاسمی اور ان کے رفقا شامل ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر سلیم اختر اور ان کے رفقا جن سے اختلافات شاید شخصی ہو گئے تھے حالانکہ اگر دیکھا جائے

تو سلیم اختر کی تحریریں اور افسانے بھی ''خالص ادب'' کی روایت ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلیم اختر بھی ادبی تخلیق میں کسی خارجی سیاسی اور معاشی نظریے کے حامی نظر نہیں آتے بلکہ اگر ان کی تخلیقات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو وہ انسانی نفسیاتی بنیادوں کے قریب تر معلوم ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام تر اختلاف کے باوجود وہ بھی ادب کی اسی روایت کے حامل ہیں جس کو ''خالص ادب'' کی روایت کا نام دیا گیا ہے۔

وزیر آغا کی تحریروں کے جائزے سے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق بدرجۂ احسن ہو جاتی ہے۔ تخلیقی عمل کے بیان میں لکھتے ہیں:

> ''تخلیقی عمل کے مختلف مدارج کی نشاندہی کرنے سے قبل اس بات کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہر شخص تخلیق کار کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔۔۔ تخلیق کار وہ نہیں جسے علوم پر دسترس حاصل ہے۔۔۔ تخلیق کار وہ ہے جسے قدرت کی طرف سے تخلیقی اوصاف ودیعت ہوئے ہیں۔''(۱۰)

اس سے ظاہر ہے کہ وہ تخلیقی عمل کو ایک فطری اور پیدائشی ودیعتی عمل تصور کرتے ہیں۔ اس کو وہ اپنی کتاب ''تخلیقی عمل'' میں ''ایک مذہبی میلان'' کے طور پر بیان کرتے ہیں اور اس بات کا مداوا اپنی کتاب ''نئے مقالات'' میں یوں کرتے ہیں:

> ''ایک تخلیق کار کے ہاں تخلیق کا وصف وہبی ہوتا ہے جسے وہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ریاضت اور تربیت کا عمل وہبی میلان کو جِلا تو بخش سکتا ہے اسے جنم نہیں دے سکتا۔ بعض اوقات، ماحول کی ناسازگاری کے باعث ایک تخلیق کار اپنی تخلیقی اُپج کو بروئے کار لانے سے محروم رہ جاتا ہے۔''(۱۱)

اس سے ظاہر ہے وہ تخلیقی عمل کو وہبی، قدرتی اور پیدائشی میلان خیال کرتے ہیں جس میں ریاضت اور تربیت سے بہتری تو ہو سکتی ہے لیکن یہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''ایک تخلیق کار بنیادی طور پر فطرت کا عطیہ ہے مگر وہ زندگی کے چونے اور گارے کو استعمال کرنے پر بہر حال مجبور ہے کہ ایسا کیے بغیر وہ اپنا ابلاغ کر ہی نہیں سکتا۔''(۱۲)

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وزیر آغا تخلیقی عمل کو قدرت کی ودیعت خیال کرتے ہیں۔ فنکار اکتسابِ عمل اور زندگی کے تجربوں سے اس میں رنگ تو بھرتا ہے کہ وہ اس کے ابلاغ کا ذریعہ ہے لیکن بنیادی طور پر یہ میلان فطرت کا عطیہ ہے۔ ان تجربات میں انسان کے لاشعور میں محفوظ صدیوں کے قدیمی تجربات بھی شامل ہیں جنھیں وزیر آغا ''منفعل تجربات'' قرار دیتے ہیں اور جو علامتی اور اشاراتی طور پر آرکی ٹائپ تمثال کے طور پر انسانی سائیکی میں موجود ہوتے ہیں۔[۱۳] اس کے علاوہ فنکار کے اپنے زندگی کے تجربات ہیں۔ ان کو وہ فعال تجربات قرار دیتے ہیں۔[۱۴] لیکن یہ سب خام مال ہیں۔ اصل تخلیقی عمل کو وزیر آغا ''روشنی کا کوندا''[۱۵] کا نام دیتے ہیں اور یہ ایسا عمل ہے جو ''سو فیصد وہبی''[۱۶] ہے۔

وزیر آغا اپنے مضمون ''ادب اور سیاست'' میں اپنے نقطۂ نظر کی تاریخی لحاظ سے وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی سے قبل ادب کی کارکردگی کے بارے میں اکثر لوگ متفق الخیال تھے۔ اس زمانے میں ادب اپنی منزل آپ تھا۔''[۱۷]

یہ اردو ادب کی تاریخ میں خالص ادب کی روایت کی نشاندہی ہے۔ اسی کو ترقی پسندوں نے ''ادب برائے ادب'' کہا لیکن اس ترکیب میں برائے کا لفظ نہایت گمراہ کن ہے جیسے ادب بھی کوئی ایسی شے ہے جو کسی اور استعمال میں آسکتی ہو یا برائے فروخت ہو یا اس پر کرائے پر دینے کا بورڈ لگایا گیا ہو جبکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ادب خود ہی اپنی منزلِ مقصود ہے۔ وزیر آغا اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ادب کا منتہائے مقصود ہی تہذیبِ ذات ہے۔''[۱۸]

ان کا خیال ہے کہ:

> ''اب کوشش عام طور پر ہونے لگی ہے کہ ادب کے ساتھ کوئی سیاسی مقصد ٹانگ کر اس سے ایک خاص سیاسی نظریے کی تکمیل کے لیے دوسرے آلاتِ حرب کی طرح استعمال کیا جائے۔''[۱۹]

وہ نتیجہ نکالتے ہیں:

> ''جب ادب کو کسی مخصوص نظریے کی ترویج کے لیے استعمال کیا جائے تو تخلیق کا بھرپور عمل جاری نہیں رہ سکتا۔''[۲۰]

اور

''ادب کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔''(۲۱)

تخلیقی عمل کا یہ نظریہ بنیادی طور پر وہی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مضمون ''کلامِ موزوں کے باب میں خیالات'' میں پیش کیا تھا اور جو خالص ادب کی روایت کی بنیاد میں شامل ہے۔ یہ ترقی پسندوں کے نظریے سے بہت مختلف ہے جو ادب کو زندگی کی مادی جدلیت کی پیکار میں ایک آلہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ سرمایہ و محنت کی جنگ میں پرولتاری قوتوں کا آلۂ کار بن سکیں۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث اصل میں ترقی پسندوں کی اصطلاحوں کے منقلب مفاہیم کی بحث ہے اور یہ صحیح معنوں میں اس موضوع سے انصاف نہیں کرتی کیونکہ جب آپ ادب میں برائے کا لفظ لے آتے ہیں تو آپ اپنے ودیعتی مقصد سے دور چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے ادب کے اس نظریے کو ہم نے ''خالص ادب'' کے نام سے معنون کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، تنقید اور مجلسی تنقید، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴

۲۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء

۳۔ ایضاً

۴۔ ڈاکٹر اے۔بی۔ اشرف، ادب اور سماجی عمل، ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۰ء، ص ۲۶

۵۔ مولانا صلاح الدین احمد، صریر خامہ، لاہور: المقبول پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء، حصہ دوم، ص ۱۰۸

۶۔ ڈاکٹر محمد خاں اشرف، ادب کیا ہے، مشمولہ "الحمرا"، لاہور: شمارہ اگست/ستمبر ۲۰۱۷ء

۷۔ ایضاً

۸۔ مولانا محمد حسین آزاد، مضمون/لیکچر، کلامِ موزوں کے باب میں خیالات، مشمولہ نظمِ آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر، لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۴۷ء، ص ۲۰

۹۔ مولانا صلاح الدین احمد، صریرِ خامہ، ص ۱۸۲

۱۰۔ وزیر آغاز، نئے مقالات، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۶۔ وزیر آغا، تنقید اور مجلسی تنقید، ص ۴۴

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۴

۲۱۔ وزیر آغا، تنقید اور مجلسی تنقید، ص ۴۵